بحث و نظر

اسرائیل سے صُلح کے جواز پر ایک مکالمہ

گذشتہ دنوں کویت جانے کا اتفاق ہوا، تو ایک دن وہاں کے معروف سیکولر اخبار الوطن کے صفحہ اول پر جلی سرخی میں اس خبر پر نظر پڑی کہ "شیخ بن باز نے اسرائیل کے ساتھ صلح کا فتویٰ دے دیا"۔ میں اور اکثر کویتی احباب یہ خبر پڑھ کر سکتے میں آگئے کہ کیا واقعی شیخ بن باز ایسا کوئی فتویٰ دے سکتے ہیں۔ بعض سلفی بھائیوں نے شدت جذبات میں اس خبر کو اخبار کی شرارت قرار دیا۔ کویت سے قطر پہنچے تو پتا چلا کہ شیخ یوسف قرضاوی نے شیخ بن باز کے اس مذکورہ فتوے کا جواب دیا ہے۔ شیخ قرضاوی کے جواب کے چند ہی روز بعد شیخ بن باز کی طرف سے کویتی رسالے المجتمع میں اسرائیل کے ساتھ صلح کے جواز پر اصرار کیا گیا۔ شیخ قرضاوی نے اگلے ہی ہفتے شیخ بن باز کو پھر جواب الجواب لکھا۔ اس سارے علمی مکالمے کا خلاصہ پیش خدمت ہے:

شیخ عبدالعزیز بن باز، مفتی اعظم سعودی عرب، نے اسرائیل کے ساتھ صلح اور قیام امن کے جواز کے لیے بنیادی طور پر دو دلیلیں دیں: پہلی یہ قرآنی آیت کہ ' وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ '، اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو (الانفال ۸:۶۱)۔ دوسری دلیل کہ کسی بھی دشمن کے ساتھ عبوری یا مستقل جنگ بندی جائز ہے۔ خود آنحضور ؐ نے مشرکین مکہ سے صلح حدیبیہ کی اور دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔ آپ ؐ نے کئی عرب قبائل کے ساتھ بھی مستقل صلح نامے کیے۔ اس لیے حاکم وقت کے لیے جائز ہے کہ وہ اگر قرین مصلحت سمجھے تو دشمن کے ساتھ صلح کرلے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اس فتوے کے جواب میں کہا: نصوص قرآن و سنت پر کوئی اختلاف نہیں، لیکن موجودہ حالات پر ان کا اطلاق درست نہیں۔ سورہ انفال میں صلح اس وقت جائز قرار دی گئی ہے جب دشمن بھی صلح کا میلان رکھتا ہو۔ مگر فلسطین پر قابض یہودیوں نے کبھی بھی صلح کا حقیقی

میلان ظاہر نہیں کیا۔ وہ مسلسل ہمارے بھائیوں کا خون بہا رہے ہیں' انھیں گھروں سے نکال کر وہاں اپنی بستیاں تعمیر کر رہے ہیں اور ہم یہ کہیں کہ وہ صلح کی طرف مائل ہیں! اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی آپ کے گھر پہ قبضہ کر لے اور آپ کو وہاں سے نکال دے۔ جب آپ اپنا گھر واپس لینے کے لیے اس کے ساتھ جہاد شروع کر دیں' تو وہ سالہا سال کی جدوجہد کے بعد آپ سے کہے کہ آؤ مجھ سے صلح کر لو' میں تمھارے لیے ایک کمرہ خالی کر دیتا ہوں۔ یہ لے لو' اور آیندہ نہ مجھ سے کوئی مطالبہ کرو اور نہ لڑائی' بلکہ اپنے گھر پر میرا مستقل حق تسلیم کر لو۔ اس صورت میں سورہ انفال کی مذکورہ آیت کا نہیں' سورہ محمد کی آیت نمبر ۳۵ کا اطلاق ہو گا کہ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ، پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو' تم ہی غالب رہنے والے ہو' اللہ تمھارے ساتھ ہے اور تمھارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

رہی عارضی صلح کی دلیل تو سوال یہ ہے کہ کیا اس معاہدے کے تحت طرفین کو جنگ بند کر دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا؟ جو معاہدہ ہو رہا ہے اس میں ایک برائے نام علاقے کے علاوہ باقی سارا فلسطین' حتیٰ کہ القدس بھی' یہودیوں کی ملکیت قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ سب محض جنگ بندی کے ضمن میں کیسے آسکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ غاصب اس وقت تک صلح کا حقیقی خواہاں نہیں سمجھا جاسکتا جب تک وہ غصب شدہ املاک واپس نہ کر دے۔ ان املاک پر غاصب کا قانونی حق تسلیم کر لینا محض جنگ بندی نہیں ہے۔

شیخ قرضاوی کے جواب میں ہفت روزہ المجتمع 'کویت' میں شیخ بن باز کا یہ موقف شائع ہوا:

"میں شیخ قرضاوی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے جس بات کو حق جانا اس کی مزید وضاحت کا موقع دیا۔ ان کے نکات کے جواب میں عرض ہے کہ قریش نے بھی مہاجرین مکہ کے گھروں اور مال و متاع پر قبضہ کر لیا تھا' لیکن ان کے تمام ظلم و ستم کے باوجود آنحضور ؐ نے ان کے ساتھ صلح حدیبیہ کر لی' کیونکہ آپ ؐ اس میں تمام مسلمانوں کی مصلحت سمجھتے تھے۔ شیخ قرضاوی نے مثال دی ہے کہ اگر کوئی گھر پہ قبضہ کر لے' اور پھر اس کا کچھ حصہ دے کر صلح کرے' تو یہ جائز نہیں ہے۔ میں ان کی اس رائے کو بے حد عجیب و غریب بلکہ بالکل غلط سمجھتا ہوں' کیونکہ اگر ایک مظلوم ظالم کے ساتھ صلح کر کے ایک آدھ کمرہ ہی حاصل کر لیتا ہے تو یہ اس کے باہر پڑے رہنے سے بہرحال بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے' فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ، اللہ سے اپنی استطاعت بھر تقویٰ اختیار کرو۔ اور فرمایا ہے' وَالصُّلْحُ خَيْرٌ، صلح بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا ..... الخ اس صورت میں لاگو ہوتا ہے جب مظلوم

ظالم سے زیادہ طاقتور ہو اور بزور قوت اپنے حقوق حاصل کر سکتا ہو۔ایسی صورت میں کمزوری دکھانا اس کے لیے جائز نہیں ہے۔لیکن اگر مظلوم ظالم سے کمزور ہو تو صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جب مشرکین نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا اور آپؐ نے قوت جمع کر لی،تب آپ نے ان پر حملہ کیا۔

ان دلائل کی روشنی میں شیخ قرضاوی اور دوسرے علماے کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے موقف پہ نظر ثانی کریں۔میری یہ بات خاص طور پر ذہن میں رہے کہ مشرک یہودیوں سے عملی جہاد اس وقت فرض ہو گا جب ہم انھیں زیر کرنے کی قوت و قدرت حاصل کر لیں۔۔لیکن جب تک قوت و قدرت نہ ہو تب تک صلح کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

شیخ یوسف القرضاوی نے جواب دیتے ہوئے لکھا: میں نے عرض کیا تھا کہ مجھے اصل اختلاف آیات و احادیث میں وارد احکام ثابتہ سے نہیں، ان احکام کے موجودہ حالات پر انطباق سے ہے۔اور ان حالات و واقعات سے عدم واقفیت کی بنا پر شیخ بن باز سے اس سلسلے میں چوک ہو رہی ہے۔

میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر کسی کو اس کے غصب شدہ گھر کا ایک کمرہ مل رہا ہو تو وہ اسے حاصل نہ کرے۔لیکن ہر روز فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر کے وہاں نئی یہودی بستیوں کی تعمیر کیے چلے جانے والا، ایٹمی اسلحے کے انبار لگانے والا، اور عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کرنے سے بھی انکاری، صلح کی طرف مائل کیسے قرار پائے گا؟ اب جو صلح کی بات ہو رہی ہے، وہ صرف ایک دھوکہ ہے تاکہ صلح کے پردے میں مزاحمت اسلامی کی تحریک جہاد کو ختم کیا جا سکے، اور امن معاہدے کے نام پر فلسطینیوں کو فلسطینیوں سے لڑایا جائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشرکین مکہ کے ساتھ صلح حدیبیہ اور موجودہ صورت حال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔مکہ قریش کا گھر اور ان کا شہر تھا، اور مسلمان خود مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تھے۔جبکہ اسرائیل فلسطین میں ایک بیرونی عنصر ہے، جس نے وہاں قبضہ کر کے امت مسلمہ کے عین قلب میں اپنی سلطنت قائم کر لی ہے۔پھر حدیبیہ کا معاہدہ ایک مخصوص مدت کے لیے مجرد جنگ بندی کا معاہدہ تھا۔اس طرح کے معاہدے مسلمانوں کی مصلحت کی صورت میں اہل حل وعقد قبول کر سکتے ہیں، لیکن یہودیوں کے ساتھ جو معاہدہ ہو رہا ہے وہ جنگ بندی نہیں فلسطین پر ان کا حق تسلیم کرنا ہے۔اس کے بعد ہم ان کے ساتھ جہاد تو کجا ان سے اس علاقے کی واپسی کا زبانی یا کاغذی مطالبہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ صلح حدیبیہ کوئی اجتہادی فیصلہ نہیں تھا بلکہ وحی الٰہی کا فیصلہ تھا۔ اس لیے آنحضورؐ نے اس صلح پر بحث کرنے والوں کو جواب دیا تھا: میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔اس کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور وہ مجھے کبھی بھی ضائع نہیں کرے گا۔

جناب شیخ کا یہ قول کہ یہ معاہدہ آیت "وَالصُّلحُ خَیرٌ" کا تقاضا ہے' اس لیے درست نہیں کہ اس سے مراد ہر قسم کی صلح نہیں 'بلکہ وہی صلح ہے جو امت کے حقوق ضائع کرنے کی موجب نہ بنے اور نہ ہی سرزمین اسلام پر غاصبوں کا حق تسلیم کرے۔ حدیث نبوی ؐ نے بھی اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے: مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے لیکن وہ صلح نہیں جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال (ترمذی)۔

شیخ محترم کا یہ کہنا کہ آیت 'فَلَاتَھِنُوا وَتَدعُوا .... الخ 'کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب مظلوم ظالم سے زیادہ طاقتور ہو' آیت کے سیاق کے مطابق نہیں ہے۔ یہ آیت قوی ہونے کی صورت میں نہیں کمزور ہونے کی صورت میں یا کمزور پڑ کر صلح سے روکتی ہے۔ اسی لیے "دعوت سلم" کو "وھن" پر عطف کیا گیا ہے۔ یہ واؤ اگر معیت کے معنی میں ہو تب بھی یہی مفہوم نکلتا ہے۔ طبری سمیت تمام بڑے مفسرین بھی یہی کہتے ہیں۔

جناب شیخ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد اس وقت فرض ہو گا جب جہاد کی قوت و مقدرت ہو۔ مقدرت کی شرط اس صورت میں ہوتی ہے جب خود حملہ کر کے دشمن کے شر سے محفوظ ہونا ہو' اور اس سے جزیے یا اسلام میں سے ایک چیز قبول کروانا ہو گا۔ اسے جہاد طلب کہتے ہیں۔ لیکن دفاعی جہاد میں جب دشمن آپ پر حملہ کر دے' تو پھر جس قدر بھی وسائل مہیا ہو سکیں انھی کے ساتھ جہاد فرض ہے۔ جہاد طلب عموماً فرض کفایہ ہوتا ہے' جبکہ جہاد دفاع فرض عین ہوتا ہے۔ پہلے اس پر جس پر حملہ ہو جائے' اور اگر وہ اکیلا دفاع نہ کر سکتا ہو تو پوری امت پر۔

شیخ محترم کے نزدیک اولی الامر اگر کسی معاہدے کو مفید سمجھتے ہوں تو ہمیں ان کی اطاعت کرنا چاہیے۔ لیکن ابن تیمیہ اور دوسرے علمائے کبار کے نزدیک اولوالامر اہل حکومت بھی ہیں اور اہل علم بھی۔ اس لیے دونوں کی رائے کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔ شیخ الاسلام کی مجموع الفتاوٰی (۲۸/ ۱۷۰) اولی الامر کی شرح پر تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے۔ اگر ہم صرف حکمرانوں ہی کو اولی الامر مان لیں' تب بھی مراد وہی حکمران ہوں گے جن کی بیعت کتاب و سنت کی روشنی میں ہوئی ہو اور جو بااختیار اور آزاد ہوں۔ ایسا حکمران جو دشمنوں کے تابع ہو اور جس کے اختیارات کی حدود دشمن طے کرے' وہ ان اولی الامر کے زمرے میں کیسے آسکتا ہے جن کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہو۔ پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ حقیقی اولی الامر کی اطاعت بھی صرف 'معروف' میں ہی ہو سکتی ہے 'منکر' میں نہیں۔ مسلمانوں کی سرزمین سے غاصب یہودیوں کے حق میں دستبردار ہو جانا امت کی مصلحت سے عاری اور صرف یہودیوں کی مصلحت و مفاد میں ہے۔ (عبدالغفار عزیز)

چند مشورے

روزنامہ جنگ کراچی (۲۲جنوری) میں جناب ارشاد احمد حقانی نے ''قاضی حسین احمد -- کرنے کا کام'' کے عنوان سے انھیں چند مشورے دیے ہیں، جن میں سے بعض کا تعلق مسلمان عورت کی حیثیت سے ہے۔ جس میں اس کا پردہ اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے عورت کے معاشرتی مقام اور کردار کے بارے میں جماعت اسلامی کا موقف جزوی عدم توازن اور غیر حقیقت پسندی کا آئینہ دار ہے۔ یہ موقف اسلام کی تعلیمات سے زیادہ ایک خاص معاشرتی پس منظر اور سوچ کا پیدا کردہ تھا۔ میں عورت کے کردار کے بارے میں ملائشیا اور ایران کے ماڈلز کو درست اور پسندیدہ سمجھتا ہوں۔ جماعت اسلامی کو باضابطہ طور پر عورت کو چہرہ اور ہاتھ کھولنے اور معاشرتی زندگی میں بعض حدود کے اندر کام کرنے کی اجازت دینے کا اعلان کر دینا چاہیے۔ اس دور میں عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود کر دینا اور چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی اجازت نہ دینا اور اسے چھوئی موئی بننے پر مجبور کرنا کسی طرح تعلیمات اسلامی کا تقاضا نہیں۔

ہماری نگاہ میں یہ خیالات و ارشادات اپنے مضمرات کے اعتبار سے حد درجہ خطرناک ہیں۔ ان کی زد ہمارے پورے معاشرتی نظام، ادارہ خاندان، اخلاقی اقدار اور اعتقادات پر پڑتی ہے۔ ایمان کو چھوڑ کر عقل کو راہ نما بنایا جائے تو یہ عیار ہے، سو بھیس رکھتی ہے۔ کیا یہ شریعت کا حلیہ نہیں بگاڑ دے گی۔ آج حقانی صاحب عورت کے ان ماڈلز کو پسندیدہ باور کرا رہے ہیں جو انھیں ملائشیا یا ایران میں نظر آئے اور بھاگئے۔ کل کوئی اور مشیر اٹھ کر پیرس، لندن اور نیویارک و واشنگٹن کے ماڈلز کی وکالت و نمایندگی کر سکتا ہے۔ زینب الغزالی کو امت مسلمہ کی تاریخ میں پہلی مفسرہ قرآن ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ممتاز خاتون اسکالر، بنت الشاطی کو شاہ فیصل ایوارڈ مل چکا ہے۔ جب چہرے کو کھولنے کے لیے ماڈلز ہی کی جستجو ہے تو پھر ان خواتین کو کیوں نہ اسوہ بنایا جائے۔ مگر نظر انتخاب وہیں پڑتی ہے جہاں اپنے ذوق و عقل کو تسکین ملے۔ چنانچہ چہرہ اور ہاتھ کھولنے کے ضمن میں زینب الغزالی اور بنت الشاطی کی مثال انھیں اچھی نہیں لگی، ملائشیا اور ایران کے ماڈلز پسند آئے۔ پاکستان میں عورت سے متعلق جماعت اسلامی کا موقف، فرض کیا کہ اسلام کی تعلیمات سے زیادہ ایک خاص معاشرتی پس منظر اور سوچ کا ہی پیدا کردہ ہے، تو بھی گوارا ہے، لیکن اس مسئلے کو تجدد پسند عقل کے سپرد کر دیا گیا تو جس طرح کا اخلاقی و عملی بگاڑ رونما ہو گا وہ ہرگز ایسی چیز نہیں کہ اسے گوارا کرنے پر جماعت اسلامی خود کو آمادہ کر سکے۔ معاشرتی پس منظر اور سوچ بننے میں انسانوں کے طویل تجربات و مشاہدات کارفرما ہوتے ہیں لیکن عقل و دانش کے زاویے روز بدلتے رہتے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ چہرے کا پردہ واقعی کسی معاشرتی پس منظر اور سوچ کی اختراع ہے یا شریعت نے اسے مستقل ضابطے اور حکم کے طور پر لازم ٹھہرایا ہے۔

پردے کا یہ حکم سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۵۹ میں وارد ہوا ہے۔ مولانا مودودی ؒ نے اپنی معروف کتاب "پردہ" میں لکھا ہے: یہ آیت خاص چہرے کو چھپانے کے لیے ہے۔ جلابیب جمع ہے جلباب کی جس کے معنی چادر کے ہیں۔ ادناء کے معنی ارخاء یعنی لٹکانے کے ہیں۔ لفظی ترجمہ یہ ہو گا: اپنے اوپر اپنی چادروں میں سے ایک حصہ لٹکا لیا کریں۔ یہی مفہوم گھونگھٹ ڈالنے کا ہے۔ مگر اصل مقصد کوئی خاص وضع نہیں ہے بلکہ چہرے کو چھپانا مقصود ہے ' خواہ گھونگھٹ سے چھپایا جائے یا نقاب سے یا کسی اور طریقے سے۔

اس کے بعد مولانا نے ابن جریر طبری ' ابوبکر الجصاص ' نیشا پوری ' رازی اور بیضاوی کی آرا نقل کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ چہرے کے پردے کی روایت کسی خاص علاقے کی نسبت سے اور کسی مخصوص معاشرے کی معاشرتی اقدار کے تابع نہیں ہے۔ سید مودودی ؒ لکھتے ہیں: "صحابہ کرام ؓ کے مبارک دور سے لے کر آٹھویں صدی تک ہر زمانے میں اس آیت کا ایک ہی مفہوم سمجھا گیا ' اور وہ مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ سے ہم نے سمجھا ہے۔ اس کے بعد احادیث کی طرف رجوع کیجیے تو وہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد سے عہد نبوی ؐ میں عام طور پر مسلمان عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈالنے لگی تھیں اور کھلے چہروں کے ساتھ پھرنے کا رواج بند ہو گیا تھا"۔

ایک ممتاز عرب اسکالر ڈاکٹر علی مشاعل اپنی کتاب " النظام الاجتماعی و السیاسی فی الاسلام " میں لکھتے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں سے امام مالک ؒ امام احمد ؒ اور امام شافعی ؒ تو عورت کا چہرہ پردے میں رکھنا فرض اور اس کا کھولنا حرام سمجھتے تھے ' البتہ فقہائے احناف میں سے بعض نے یہ رائے دی ہے کہ عورت گھر سے باہر جاتے ہوئے اپنا چہرہ کھلا رکھ سکتی ہے۔ لیکن جو فقہا نامحرموں کے سامنے چہرہ کھولنے کے جواز کے قائل ہیں ' ان کا بھی موقف یہ ہے کہ جب فتنوں کا دور ہو اور ماحول میں اخلاقی بگاڑ عام ہو جائے تو عورت کا چہرہ ڈھانپنا ضروری ہو جاتا ہے۔

جناب ارشاد احمد حقانی انصاف کے ساتھ بتائیں کہ جس دور اور ماحول میں ہم سانس لے رہے ہیں ' یہ اخلاقی اور ذہنی انارکی کا دور ہے یا نہیں۔ ان حالات میں جب کہ آوارہ جذبات اور شہوتوں کی آگ بھڑک رہی ہے ' جو عفت مآب اور حیادار خواتین اس آگ سے بھاگ کر شریعت اسلامی کے احکام کے سائے میں پناہ لیے ہوئے ہیں انھیں گھسیٹ کر آپ اس آگ میں جھونکنے پر یہ اصرار آخر کیوں کر رہے ہیں؟ پردہ دار اور باحیا عورت اسلام کی تہذیبی اقدار کی امانت کی آخری پاس دار اور

محافظ ہے۔اسلامی تعلیمات کے رنگ میں رنگا ہوا مسلمان گھرانہ اسلام کا وہ قلعہ ہے جہاں ہر طرف سے پسپا ہوتی ہوئی اسلامی تہذیب بالآخر پناہ اور سلامتی پائے گی۔اسے تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمان عورت کی پردہ داری نے پہلے بھی کئی مرتبہ بچایا ہے۔سو ڈیڑھ سو سال پہلے 'جب برصغیر میں غالب قوم کو اپنی تہذیب کے غلبے میں مشکل پیش آئی تو اس کے شہ دماغ بڑے غور و خوض کے بعد مسلمان عورت کے بارے میں اسی نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان عورت کو کسی عنوان سے چراغ خانہ کی حیثیت سے نکال کر شمع محفل بننے پر آمادہ کر لیا جائے۔

یہ امت ہے بڑی سخت جان۔ان صدموں سے گزر کر 'اس کی غیرت و حیا پھر عود کر آتی ہے۔مصر' ترکی 'ایران وغیرہ میں غیرت اور نسوانیت کے جنازے سرکاری اہتمام میں نکالے گئے تھے۔الحاد پسندوں اور اباحیت پرستوں نے اپنے زعم میں نسوانی حیا اور عظمت کا آبگینہ توڑ کر اس کے ریزے یورپی آقاؤں کے اطمینان کے لیے پیش کر دیے تھے۔لیکن ان ممالک کے اندر اکیسویں صدی کے دروازے سے داخل ہوتی ہوئی جدت کے سارے مظاہر اور اس کے مضمرات کا مشاہدہ کرتی ہوئی دختران ملت ' ایک مہم کی طرح سر ڈھانپنے پر مصر ہو گئی ہیں۔انھیں درسگاہوں سے اس پاداش میں خارج کیا جا رہا ہے 'سزائیں دی جا رہی ہیں' ہراساں کیا جا رہا ہے 'لیکن یہ رجحان دبنے کے بجائے پھیلے ہی جا رہا ہے۔فرانس تہذیب نو کے اماموں میں سے ہے۔ آج فرانس کی درس گاہوں کے اندر ایمانی غیرت اور نسوانی عظمت و عفت کا چمن کھل اٹھا ہے۔مسلمان بچیوں کو سر پر سکارف اوڑھنے کے جرم میں درس گاہوں سے نکالا جا رہا ہے لیکن وہ اپنے تعلیمی مستقبل کی تاریکی سے نہیں ڈر رہی ہیں۔ان بچیوں کو ابھی سکارف سر پر رکھنے کی حد تک ہی اسلامی احکام کا علم ہو سکا ہے۔حالات بتا رہے ہیں کہ چہرے پر نقاب ڈالنے کے شرعی حکم سے انھیں آگاہی ہوئی تو وہ اس مرحلے سے بھی گزر جائیں گی۔

حقانی صاحب ""حجاب اور نیم حجابی کی ایک عجیب معجون مرکب"" تیار کرنے کے قائل نظر آتے ہیں۔مولانا مودودیؒ نے ایسے لوگوں کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک طرف تو یہ ""اپنی عورتوں کو حیا اور عصمت کے زیوروں سے آراستہ اور اپنے گھروں کو اخلاقی نجاستوں سے پاک رکھنے کے خواہش مند ہیں اور ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو مغربی تمدن اور معاشرت کے اصولوں کی پیروی سے رونما ہوئے ہیں اور ہونے چاہییں۔مگر دوسری طرف اسلامی نظم معاشرت کے اصول و قوانین کو توڑ کر 'کچھ رکتے' کچھ جھجکتے اسی راستے کی طرف اپنی بیویوں' بہنوں اور بیٹیوں کو لیے جا رہے ہیں جو مغربی تہذیب کا راستہ ہے۔یہ لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ آدھے مغربی اور آدھے اسلامی طریقوں کو جمع کر کے یہ دونوں تہذیبوں کے فوائد و منافع اکٹھے کر لیں گے۔

یعنی ان کے گھروں میں اسلامی اخلاق بھی محفوظ رہیں گے اور ان کی خاندانی زندگی کا نظم بھی برقرار رہے گا اور اس کے ساتھ ان کی معاشرت اپنے اندر مغربی معاشرت کی برائیاں نہیں بلکہ صرف اس کی دل فریبیاں 'اس کی لذتیں اور ان کی مالی منفعتیں جمع کرے گی" (پردہ)۔

اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تجدد کی راہ پر رکھا ہوا قدم ایک دفعہ اٹھ کر اسی حد پر رک جائے گا جو حد حقانی صاحب بتا رہے ہیں۔ اس سوال کا ایک جواب ہم مولانا مودودی ؒ کے الفاظ میں سامنے رکھتے ہیں: "یہ بھی خلاف عقل اور خلاف فطرت ہے کہ ایک مرتبہ اسلام کے مضبوط اخلاقی نظام کی بندشیں ڈھیلی کرنے اور نفوس کو قانون شکنی سے لذت آشنا کر دینے کے بعد اس سلسلے کو اسی حد پر روک رکھیں گے جس کو آپ نے خالی از مضرت سمجھ رکھا ہے... تمدن اور معاشرت میں ہر غلط طریقے کی ابتدا بہت معصوم ہوتی ہے مگر ایک نسل سے دوسری نسل اور دوسری سے تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے وہی چھوٹی سی ابتدا ایک خوفناک غلطی بن جاتی ہے"۔

جناب حقانی کا مشورہ اگر بے ضرر سا معاملہ ہوتا تو ہم اس تفصیل کے ساتھ اس بحث میں نہ پڑتے۔ مگر کسی بڑے دشمن اسلام نے کہا تھا کہ "مسلمان عورت کے سر اور چہرے کو ڈھانپنے والے کپڑے کو وہاں سے اتارو اور قرآن کو اس میں لپیٹ دو۔ مسلمانوں کے زوال و تباہی کا سب سے کارگر نسخہ یہی ہے"۔ اس کا مطلب ہے کہ اسلام کے دشمن اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اسلام ان کے لیے اس وقت تک خطرہ ہے جب تک مسلم خاتون کا سر اور چہرہ مستور اور قرآن کھلا ہوا ہے۔

جناب حقانی کی طرف سے یہ مشورہ پیش کرنے کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والی خواتین نے ایسی کوئی فریاد کی ہو کہ وہ جبراً پردے کی پابند بنائی گئی ہیں اور ان ستم رسیدہ عورتوں کی گھٹی گھٹی فریادیں کسی طریقے سے ان کے کان میں پڑ گئی ہیں۔ مگر ہم بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی جو خواتین حجاب و نقاب کی پابندی اختیار کیے ہوئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جسے زبردستی پردہ کرایا گیا ہو۔ یہ پردہ انھوں نے خالص دینی تقاضا سمجھ کر اختیار کیا ہے۔

حقانی صاحب کے اس مشورے کا دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک جوں ہی یہ خواتین بے حجابانہ و بے باکانہ میدان میں اتریں گی 'بند دروازے کھل جائیں گے اور اسلامی انقلاب برپا ہو جائے گا۔ لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو جماعت اسلامی کی ہمدرد خواتین ساری کی ساری چہرے کے پردے کی ملتزم و پابند نہیں ہیں۔ جو پابند ہیں وہ پردے کے اہتمام کے ساتھ بازاروں سے خرید و فروخت کرتی ہیں 'معاشرتی تقاضے پورے کرتی ہیں 'بعض ایسی بھی ہیں جو مختلف شعبوں میں ملازمتیں کر رہی ہیں۔ وہ اجتماعات اور جلسوں میں شریک ہوتی ہیں 'انتخابی مہم کو اپنے دائرے میں چلاتی ہیں 'گھر اور

بچوں کو سنبھالتی ہیں۔ دنیا بھر میں مسلمانوں پر کہیں مصیبت آئی ہو' وہ احتجاجی مظاہرے کرتی ہیں' پریس کانفرنسیں کرتی ہیں۔ غرض کہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جو بے پردہ عورتیں کر رہی ہوں اور یہ باپردہ خواتین پردے میں رہتے ہوئے اسے نہ کر پا رہی ہوں۔ ایسے میں ہم یہ کیسے سمجھیں کہ خواتین کا پردہ ہی جماعت اسلامی کی کامیابی میں واحد رکاوٹ رہ گیا ہے۔ (منیر احمد خلیلی)

(صاحب مضمون کی اجازت سے مضمون کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔)

پاکستان میں خریداروں اور ایجنٹوں سے خصوصی گزارش!

- اس ماہ اپنے لفافے / پیکٹ پر اپنا پتہ ضرور چیک کر لیں۔
- اپنے پوسٹ کوڈ نمبر سے (اگر پتہ پر درج نہیں ہے تو) آگاہ کرنا لازم سمجھیں۔ خریداری نمبر لازماً ساتھ ہو۔

پوسٹ کوڈ نمبر کا اندراج بروقت اور یقینی ترسیل کے لیے ضروری ہے۔ اگر آپ کے علم میں نہیں ہے تو ڈاک خانہ سے معلوم کر لیں۔ ایک روپے کا لفافہ بھیجنے میں تکلف سے کام نہ لیں۔ آپ کی معمولی زحمت سے ترسیل کا نظام بہتر ہو جائے گا۔

مینیجر

۵-اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور